

سید محمد حسنین اور ڈاکٹر ذاکر حسین

مرتبہ: رفیع الدین ہاشمی

سید محمد حسنین (۲۳ مارچ ۱۹۱۷ء - ۱۳ جنوری ۲۰۰۵ء) اکتوبر ۱۹۴۱ء سے جماعت اسلامی ہند سے وابستہ ہوئے اور تادم مرگ یہ وابستگی قائم رہی بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ پختہ تر ہوتی گئی۔ اس دوران انھوں نے مختلف جماعتی ذمہ داریاں ادا کیں۔ مشرقی ہند کے قیم، شمالی بہار کے امیر حلقہ اور گل ہند جماعت مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔ مزید برآں درس گاہ اسلامی درہنگا کے ناظم بھی رہے۔ جماعت اسلامی سے وابستگی کے سبب کئی بار پابند سلاسل بھی ہوئے۔ بقول اے یو آصف: ”ان کی پوری زندگی جماعت کے کاز کے لیے وقف تھی“۔ (دعوت دہلی، ۷ مارچ ۲۰۰۵ء)

ان کا آبائی تعلق صوبہ بہار (کورونی، بھوپڑا، درہنگا) سے تھا۔ ابتدائی تعلیم سوری ہائی اسکول مدھوبنی سے حاصل کی۔ حصول علم کا شوق انھیں کشاں کشاں دہلی لے آیا۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں گھر والوں کو بتائے بغیر پڑھنے کے لیے آئے تھے۔ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی توجہ سے محمد حسنین کو اگست ۱۹۳۴ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ثانوی سوم میں داخلہ مل گیا۔ مئی ۱۹۴۰ء میں جامعہ سے بی اے کیا۔ زمانہ طالب علمی میں وہ ہمیشہ ہر کلاس میں اول رہے۔ مزید برآں جامعہ کالج کے طلبہ کی تنظیم انجمن اتحاد کے ناظم اور انجمن اتحاد کے ترجمان قلمی رسالے کے اڈیٹر بھی رہے۔ علامہ اقبال پر رسالے کا خاص نمبر جو ہر اقبال کے نام سے شائع ہوا۔ جامعہ میں ان کا قیام بورڈنگ ہاؤس (اقبال ہال) میں تھا۔ وہ اس ہاؤس کے سینئر مانیٹر تھے۔ روایت ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کسی موقع پر جامعہ ملیہ گئے تو سید محمد حسنین کے کمرے میں بھی تشریف لے گئے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین سے طالب علمی کے زمانے میں حسنین صاحب کا جو تعلق قائم ہوا، اسے اول الذکر نے ٹوٹے نہیں دیا، عمر بھر قائم رکھا اور آفرین ہے مؤخر الذکر پر کہ انھوں نے (باوجود گورنر صوبہ بہار اور صدر جمہوریہ ہند ہو جانے کے) حسنین صاحب کو یاد رکھا، بھلا یا نہیں۔ ذاکر صاحب فوت ہوئے تو حسنین صاحب نے حسب ذیل مضمون میں ذاکر صاحب سے اپنے تعلق کی ابتدا اور ان تعلقات میں نشیب و فراز کی تفصیل

قلم بند کی۔ یہ مضمون پٹنہ کے خدا بخش لائبریری جرنل میں شائع ہوا تھا۔

اس مضمون سے جہاں خود حسنین صاحب کے مزاج اور ان کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے، خصوصاً ان کی دعوتی سرگرمیوں اور دعوت دین کے طریق کار کا پتا چلتا ہے، وہیں ڈاکٹر ذاکر حسین کی دل نواز مگر مصلحت پسند شخصیت کی جھلکیاں بھی سامنے آتی ہیں۔ وہ جماعت اسلامی کی دعوت کو سمجھتے تھے اور کانگریسی ہونے کے باوجود جماعت کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے جیسا کہ زیر نظر مضمون سے اندازہ ہوتا ہے۔ (مرتب)

وہ ایک مرد قلندر تھے — مرث حسن عالم گیر تھا، استاد ذاکر کا —

● پہلی ملاقات: استاد ذاکر حسین رحمۃ اللہ سے میری تین یا دو ملاقاتوں میں سے پہلی ملاقات: اگست ۱۹۳۴ء میں ہوئی۔ جب میں داخلے کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی پہنچا تو داخلے کے آخری مرحلے پر مجھ کو استاد رحمۃ اللہ کی خدمت میں پیش کیا گیا کہ وہ میرے داخلے کے فارم پر دستخط کر دیں۔ انھوں نے تعارف کے لیے میرے حالات دریافت کیے۔ میں ایک خط لکھ کر لے گیا تھا؛ جس میں میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لینے کی غرض بتائی تھی اور یہ عرض کیا تھا کہ میں اپنی والد کی مرضی کے خلاف اپنے تعلیمی سلسلے کو چھوڑ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ اس لیے آیا ہوں کہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ یہاں اسلامی اور دنیوی دونوں طرح کی تعلیم ساتھ ساتھ دی جاتی ہے۔ مدھونی بہار کے جس اسکول میں، میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، اس میں اسلامی تعلیم کا کوئی موقع نہیں تھا اور میرے والد صاحب کا حوصلہ یہ تھا کہ وہ مجھ کو وکیل بنائیں اور مجھے وکیل بننے سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ دوسری بات یہ کہ میں چاہتا ہوں کہ جب میں اپنے والد کی مرضی کے خلاف اپنے تعلیمی سلسلے کو چھوڑ کر جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے آیا ہوں، تو ان پر اپنی تعلیم کے مصارف کا بار نہ ڈالوں اور آپ سے یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ اگر میرا داخلہ جامعہ میں ہو جائے تو تعلیمی اوقات کے علاوہ کسی وقت جامعہ کی کوئی خدمت مجھ سے لیں اور اس کے عوض اتنا معاوضہ دیں جس میں کسی طرح یہاں کا خرچ نکال سکوں۔ میرے خط کو پڑھ کر وہ خاموش رہے اور فارم پر دستخط کرنے سے پہلے فرمایا: ”میں آپ سے ایک عہد لینا چاہتا ہوں۔“ میں نے عرض کیا: وہ کیا؟ فرمایا: ”عہد کیجیے کہ میں ہمیشہ سچ بولنے کی کوشش کروں گا۔“ میں نے عرض کیا: ”الحمد للہ، میں شعوری طور پر پہلے سے اس پر عامل ہوں۔“ انھوں نے میرے فارم پر دستخط کر دیے۔

[اے یوسف راوی ہیں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ان کے شوقِ تعلیم اور جستجو کو دیکھ کر داخلے کی منظوری تو دے دی لیکن وطن واپس جا کر والد سے اجازت لے کر آنے کا کہا۔ ان کے حکم کے مطابق وہ واپس آ گئے اور پھر اجازت حاصل کی۔]

ہاں، یہ بتا دوں کہ جب میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو ایک نہایت حسین ووجہ پر وقار شخصیت سے سامنا ہوا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ۳۵-۴۰ کے قریب رہی ہوگی۔ سرخ، سفید چہرہ اور اس پر بھرپور سیاہ داڑھی، بقول حفیظ جالندھری منع جلال بھی ہے جمال بھی ہے، یہ شخصیت کا کمال بھی ہے۔ انھوں نے ہنستے ہوئے گرجوٹی سے میرا استقبال کیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ وہ ایک نہایت سفید فرش پر بیٹھے تھے۔ فرش کے اوپر ناریل کی چٹائی تھی۔ سامنے فرش میز تھی جس پر ہر چیز اپنی جگہ انتہائی سلیقے سے سجی ہوئی رکھی تھی۔ ان کی بائیں طرف دیوار پر شیشے کا ایک فریم آویزاں تھا جس پر یہ شعر خوش خطی کا بہترین نمونہ پیش کر رہا تھا۔

آسائش دو گیتی تفسیر اس دو حرف است

باد و ستاں مٹطف ، بادشمنان مدارا

جب انھوں نے میرے فارم پر دستخط کر دیے تو ان سے الوداعی مصافحہ کر کے کمرے سے باہر آیا اور بہت خوش اور مسرور تھا۔

چند دنوں کے بعد جامعہ کے احاطے میں ان سے آئنا سامنا ہوا۔ انھوں نے مجھے روک کر فرمایا: ”تعلیم ختم ہو جانے کے بعد دو گھنٹے صدر مدرس کے دفتر میں آپ کام کیا کریں گے۔ اس کے عوض آپ کو ۸ روپے ماہانہ ملا کریں گے جس سے آپ اپنا جامعہ کا خرچ پورا کرنے کی کوشش کریں۔“ اس پر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

میں نے اپنا داخلہ جامعہ میں غیر مقیم طالب علم (Day Scholar) کی حیثیت سے کرایا، کیوں کہ اس وقت جامعہ میں دارالاقامہ میں قیام و طعام کے مصارف ۱۶ روپے ماہانہ تھے۔ اس وقت میں جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی سے اتر کی جانب سبزی منڈی کے ریلوے اسٹیشن کے احاطے میں ایک مسجد میں رہتا تھا جس کی دوری جامعہ قرول باغ سے دو (۲) میل سے کم نہ تھی۔ ایک روز پھر جامعہ میں میرا اُن سے آئنا سامنا ہوا اور یہ پوچھا کہ ”آپ کہاں رہتے ہیں؟“ میں نے بتایا کہ

سبزی منڈی، ریلوے اسٹیشن کی مسجد میں۔ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ چند دنوں کے بعد پھر اسی طرح سرِ راہ ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے فرمایا: ”قرول باغ میں جامعہ سے متصل ہی ان کے عزیز، احمد خاں رہتے ہیں، جو طبیبہ کالج میں پڑھتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا ہے، ان کے کمرے میں گنجائش ہے، آپ ان کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔“ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور چند دنوں میں سبزی منڈی سے قرول باغ منتقل ہو گیا۔ احمد خاں صاحب نے اپنے کمرے میں جگہ دی لیکن کرایہ قبول نہ کیا۔

ایک سال تک ان کے ساتھ رہا۔ نہایت مخلص اور شریف آدمی ثابت ہوئے۔ ۸ روپے جامعہ سے جو بطور معاوضہ کے ملتے تھے، اس میں سوا دو روپے میں نے جامعہ کی فیس تعلیم ادا کی اور چار روپے میں جامعہ کے مطبخ سے دو نمبر کھانا جاری کر لیا جس میں صرف دال اور چپاتیاں ملا کرتی تھیں۔ باقی پونے دو روپے ناشتہ اور اوپر کے خرچ کے لیے کافی ہو جایا کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد پھر ایک روز جامعہ میں سرِ راہ ملاقات ہوئی تو استاد علیہ الرحمہ نے مجھے روک کر فرمایا: ”ڈاکٹر سلیم الزماں صاحب کے چھوٹے بچے کو شام کو ایک گھنٹہ ان کی کٹھی پر جا کر پڑھا دیا کریں۔ دس روپے ماہانہ معاوضے کے طور پر وہ دیا کریں گے۔“ اس طرح جامعہ میں بہ سہولت تعلیم حاصل کرنے کا موقع میرے لیے پیدا کر دیا اور جب تک جامعہ میں قیام رہا، ان کی نوازشوں اور کرم فرمائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔

ان ساری نوازشوں کا تذکرہ اس وقت نامناسب ہے لیکن ایک واقعے کا تذکرہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک روز جامعہ لائبریری کے برآمدے میں اسٹینڈ پر جہاں روزنامہ اخبار لگے رہتے تھے، لوگ کھڑے ہو کر اخبار پڑھ رہے تھے، میں بھی اخبار دیکھ رہا تھا۔ بائیں طرف کے راستے سے استاد علیہ الرحمہ گزر رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں اٹھائیں تو ان سے آنکھیں چار ہوئیں اور بغیر ان کو سلام کیے میں دوبارہ اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ استاد علیہ الرحمہ چلتے چلتے رُک گئے اور پھر جب میں نے نظر اٹھا کر ان کو دیکھا تو انھوں نے جھک کر مجھ کو فرشی سلام کیا اور آگے بڑھ گئے۔ میں نے جواب تو دیا لیکن سلام نہ کرنے کی کوتاہی پر بڑی ندامت محسوس کی — یہ تھا ان کا ایک اندازِ تربیت!

● دوسری ملاقات کا تاثر: ۱۹۴۰ء میں جامعہ ملیہ سے فارغ ہو کر میں درجہ گاہ گیا۔

[اے یوسف لکھتے ہیں: ”۱۹۴۰ء میں مرحوم سید صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ سے تعلیم کی فراغت کے بعد، رخصت ہوتے وقت جب ذاکر حسنین سے ملنے گئے تو انھوں نے ان سے برجستہ کہا: تمہارے لیے تو لائبریری میں ذمہ دار کا عہدہ میرے ذہن میں ہے۔ تم کہاں جا رہے ہو؟ یہیں رہو تا کہ ہم سب مل کر جامعہ کی خدمت کریں۔ اس پر حسنین سید کہنے لگے: استاد محترم، آپ نے جو تعلیم و تربیت دی ہے، اس کا تقاضا ہے کہ میں پوری زندگی اسلام کے کار میں لگا دوں، لہذا معذرت خواہ ہوں اور درجہ گاہ واپس جا رہا ہوں۔“]

۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی تشکیل عمل میں آئی اور میں اس سے وابستہ ہو گیا۔ جماعت اسلامی کا مرکز لاہور سے پٹھان کوٹ منتقل ہو گیا۔ ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ میں رکن بنایا گیا۔ مجلس شوریٰ میں شرکت کے لیے پٹھان کوٹ آتے جاتے میں دہلی میں رک کر احباب سے ملاقات اور اپنے اساتذہ کرام کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا۔ استاد علیہ الرحمہ جب علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے تب بھی دہلی آتے جاتے، ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ جماعت کا لٹریچر ان کی خدمت میں پیش کرتا اور جماعت کی سرگرمیوں سے ان کو واقف کراتا تھا۔ وہ ہمیشہ بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے تا آنکہ وہ ۱۹۵۷ء میں بہار کے گورنر ہو کر پٹنہ تشریف لائے۔ ان کا گورنری کا عہدہ قبول کرنا مجھ کو پسند نہ آیا۔ میرے خیال میں یہ منصب ان کے مقام سے بہت فروتر تھا۔ نہ میں اُن سے ملنے گیا اور نہ ان کی خدمت میں خیر مقدم کا کوئی خط ارسال کیا۔ تقریباً چھ مہینے کے بعد انھوں نے پٹنہ کے کسی صاحب سے میرے متعلق تذکرہ کیا کہ ”یہاں بہار میں میرے ایک شاگرد ہیں حسنین۔ وہ اب تک ملاقات کے لیے نہیں آئے، چنانچہ کیا بات ہے۔ کبھی کبھی وہ میرا ایمان تازہ کر دیا کرتے تھے۔“ ان صاحب نے پٹنہ میں محی شبیر احمد (جوان دنوں پٹنہ میں ایک سوڈا فیکٹری کے منیجر تھے) سے میرے بارے میں استاد علیہ الرحمہ کی گفتگو دہرائی۔ ایمان تازہ کرنے کی بات یہ ہے کہ جب میں ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا تو جماعت کی کوئی نہ کوئی کتاب ان کی خدمت میں پیش کیا کرتا تھا۔ محی شبیر احمد صاحب نے مجھ کو پٹنہ سے ایک کارڈ لکھا کہ تم اب تک اپنے استاد سے کیوں نہیں مل سکے اور استاد علیہ الرحمہ کی گفتگو نقل کی۔ اُن کا خط ملنے پر

میں نے استادؒ کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا، بعد القاب و آداب میں نے عرض کیا تھا:

”گورنری کی حیثیت سے آپ کو پٹنہ تشریف لائے ہوئے کافی دن ہو گئے، لیکن افسوس ہے کہ میں نہ تو آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکا اور نہ خیر مقدم کا کوئی خط ہی ارسال کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس الجھن میں ہوں کہ آپ کے لیے گورنری، قلندری سے کیسے افضل ہو گئی؟ اور آپ نے اسے کیسے پسند فرمایا؟ اخبارات میں یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ اس ریاست کو نمونے کی ریاست دیکھنا چاہتے ہیں لیکن جس کے کارپردازوں کا طرز عمل ظلم و جور کا ہو، اس کو نمونے کی ریاست بنانے میں آپ کو بہت دشواری پیش آئے گی۔ جماعت اسلامی ہند سے تو آپ بہت حد تک واقف ہیں۔ جماعت عملی کے سلسلے میں حکومت بہار کا جو رویہ ہے، اس کے متعلق دعوت، اخبار میں میرا ایک بیان شائع ہوا ہے۔ اس کا تراشا ارسال خدمت ہے۔“ (ان دنوں حکومت بہار نے جماعت اسلامی پر subversive activities [تخریبی سرگرمیوں] کا الزام لگایا تھا اور ملازمین کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ لوگ جماعت کی سرگرمیوں سے دور رہیں ورنہ Conduct Rule دفعہ ۳۳ کے تحت ان کے خلاف کارروائی کی جائے گی)۔ دوسری بات میں نے یہ عرض کی تھی کہ ”اب مجھ جیسا معمولی آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہونا بھی چاہے تو کیسے حاضر ہو سکتا ہے؟ اور جماعت کا کچھ تازہ لٹرچر بھی خط کے ساتھ رجسٹرڈ ڈاک سے استاد علیہ الرحمہ کی خدمت میں ارسال کر دیا لیکن پندرہ دنوں تک ان کی طرف سے نہ کوئی جواب آیا اور نہ خط کی رسید ہی ملی۔ اس پر میں نے ڈاک سے دوسرا عریضہ ان کی خدمت میں ارسال کیا اور اس میں عرض کیا کہ دو مہینوں سے زائد ہو گئے آپ کی خدمت میں ایک عریضہ اور اور چند کتابیں ارسال کی تھیں۔ تعجب ہے کہ اس کے جواب میں نہ تو آپ کا کوئی گرامی نامہ ملا اور نہ خط کی رسید ہی ملی۔ اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں آپ تک نہیں پہنچ سکیں ورنہ آپ سے ایسی توقع نہیں ہے کہ آپ میرے عریضے کا جواب نہ دیں گے۔ میرے اس عریضے کے جواب میں رانچی سے ان کا گرامی نامہ ملا۔ اس خط کا مضمون یہ ہے:

راج بھون - رانچی کیمپ، ۱۰ ستمبر ۱۹۵۷ء

عزیزم حسنین صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

آپ کے دونوں محبت نامے ملے۔ آپ کا بھیجا ہوا لٹرچر بھی ملا۔ معافی چاہتا ہوں کہ پہلے

خط کے جواب میں اتنی دیر ہوئی کہ آپ کو یاد دہانی کرنی پڑی۔ شاید آپ کو غلط فہمی ہو، اس لیے وجہ لکھ دیتا ہوں۔ میں ذاتی خطوط کے جواب لکھنے میں بہت کاہل ہوں۔ پھر اگر کوئی دوست یا عزیز اپنے خط میں کوئی ایسا سوال کر دیتا ہے، جو میری شخصی داخلی زندگی سے متعلق ہو تو مجھے اس کا جواب لکھنا اور دشوار ہو جاتا ہے۔ آپ نے اپنے پہلے خط میں الجھن یہ بتائی کہ قلندری سے گورنری کیسے اور کب سے افضل ہو گئی اور میں نے گورنری کو قلندری پر کیسے ترجیح دی؟

پہلے تو عزیز من! میں قلندر کب تھا؟ لیکن سوال کو اپنی ذات سے الگ کر کے ایک اصولی سوال سمجھوں تو اس کا بہت اچھا جواب حضرت مخدوم سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ المعروف داتا گنج بخش نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں ایک جگہ دیا ہے۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھتا:

[وہ فرماتے ہیں]: استاد ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ سے ہم نے سنا، فرمایا: فقیری اور مال داری کے سلسلے میں لوگوں نے بات کہی ہے اور اس کو اختیار کیا ہے، میں اس کو اختیار کرتا ہوں جو اللہ تعالیٰ میرے لیے پسند فرمائے اور مجھ کو اپنی نگاہ میں رکھے۔ اگر مال داری کی حالت میں رہوں تو اللہ سے غافل نہ ہونے پاؤں اور اگر غربت کی حالت میں رہوں تو حریص اور لالچی نہ بنوں۔ لہذا مال داری نعمت ہے اور اس حال میں اللہ سے غفلت آفت ہے۔ غربی اور فقری بھی نعمت ہے اور اس حال میں حرص آفت ہے۔

دوسری الجھن کا جواب سہل ہے۔ میں ابھی کوئی تین چار ہفتہ یہاں ہوں۔ وسط اکتوبر سے ان شاء اللہ پٹنہ میں رہوں گا۔ آپ ایک کارڈ میرے سیکرٹری کو لکھ دیں، وہ مجھ سے پوچھ کر آپ کے لیے وقت مقرر کر دیں گے۔ ضرور تشریف لائیے۔ مفصل گفتگو کو بہت جی چاہتا ہے۔ خدا کرے کہ آپ خیریت سے ہوں اور خوش بھی۔ خیر طلب: ذاکر حسین

میں نے استاد کی ہدایت کے مطابق ان کے سیکرٹری کو خط لکھا اور ان سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ انھوں نے وقت مقرر کر کے مجھ کو مطلع کیا۔ مقررہ وقت پر میں راج بھون پہنچا۔ ان کے ملٹری سیکرٹری نے میرا استقبال کیا اور ان کے کمرے تک میری رہ نمائی کی۔ میں کمرے کے اندر داخل ہو گیا تو انھوں نے دروازہ بند کر دیا۔ استاد کو میں نے سلام کیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ انھوں نے کھڑے ہو کر معاملے کے لیے کھینچ لیا اور اسی حال میں ہنستے ہوئے فرمایا:

”آپ لوگ حکومت پر بہت تنقید کرتے ہیں۔“ پھر اپنے قریب کی کرسی پر بیٹھنے کی ہدایت کی۔ میں نے جواب میں عرض کیا: ”جب ہم مجبور ہوتے ہیں تبھی حکومت پر تنقید کرتے ہیں۔“ اس کے بعد دوسرا سوال انھوں نے یہ کیا: ”کیا ابھی مولانا ابواللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند نے کہیں یہ کہا ہے کہ ”جماعت اسلامی پاکستان نہیں چاہتی تھی؟“ میں نے عرض کیا: ”کہا ہوگا۔ جماعت اسلامی تو پوری دنیا میں اللہ کی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے، لیکن کچھ لوگوں نے ہندستان کے دو ٹکڑوں پر ہی قناعت کر لی ہے۔“

انھوں نے فرمایا کہ ”حسنین صاحب! آپ لوگ حکومت الہیہ قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن عام طور سے ہندستان کے مسلمان حکومت الہیہ نہیں چاہتے ہیں۔“ میں نے ان سے کہا: یہ کم حوصلگی اور پست ہمتی ہے ورنہ مسلمان کی حیثیت سے: ”ہر ملک، ملک ماست کہ ملک خدا ماست۔“ ہر ملک میں حکومت الہیہ یا اللہ کا دین قائم ہونا چاہیے۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا: ”آپ کی حکومت نے جماعت اسلامی کو subversive [تخریبی] کیسے قرار دے دیا، ہم لوگ تو پر امن طریقے پر لوگوں کو اللہ کے راستے پر بلاتے ہیں، کوئی توڑ پھوڑ، قتل و غارت گری کا طریقہ نہیں اپناتے ہیں۔“ انھوں نے فرمایا: ”subversive ہونے کے لیے اتنا کافی ہو سکتا ہے کہ حکومت کے دستور کو تسلیم نہ کیا جائے اور غیر پارلیمانی طریقے سے حکومت کو تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے۔ دیکھیے! کمیونسٹوں نے ملک کے دستور کو مان کر کیرالا میں الیکشن میں حصہ لیا اور الیکشن میں کامیاب ہونے پر وہاں حکومت بنائی۔ آپ لوگ بھی دستور کو مان کر پارلیمانی طریقے سے حکومت کو بدل سکتے ہیں۔“ میں نے عرض کیا کہ اگر subversive سے یہ مطلب ہے تو ہم اقراری مجرم ہیں۔ یہ فرمائیے کہ کیا ہم آپ کی ریاست میں اللہ کا نام لے سکتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ اس سے آپ کو کون روک سکتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ جب ہم لا الہ الا اللہ کی تشریح کریں گے تو پھر subversive آجائے گا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ ایک چیز پھل ہے اور ایک چیز درخت ہے۔ پھل سے اگر لوگوں کو اختلاف ہے، قبل از وقت پھل کا تذکرہ مت کیجیے۔ درخت لگانے کی کوشش کیجیے۔ جب لوگ آپ کے بیٹھے پھل کو چکھیں گے تو مخالفت ترک کر دیں گے۔ میں نے بہ ادب عرض کیا: درخت لگانے کا عمل چپکے سے اور اکیلے تو نہیں ہوگا، اس کی خوبیوں کو بتا کر کچھ لوگوں کو توابنے

ساتھ لینا ہی ہوگا اور ان کے تعاون ہی سے یہ کام انجام پاسکتا ہے۔ میں نے جماعت اسلامی کی دعوت اور طریقہ کار کا مختصراً تعارف کرایا۔ آپ نے توجہ اور صبر سے میری باتوں کو سنا اور فرمایا: ”ٹھیک ہے جس بات کو آدمی حق سمجھے، اس کے لیے جدوجہد کرے۔“ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ ”آپ کی حکومت میری ہمہ وقت نگرانی کیوں کرتی ہے؟ سی آئی ڈی کے دو آدمی سایہ کی طرح میرے ساتھ رہتے ہیں؟“ جواب میں انھوں نے فرمایا: ”یہ آپ کے لیے ہی مخصوص نہیں ہوگا، تمام سیاسی ورکروں کی نگرانی کی جاتی ہے، آپ کی بھی کی جاتی ہوگی۔ اس میں گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اپنا کام کرتے ہیں، آپ اپنا کام کیجیے۔ راہ حق میں دشواریاں تو پیش آتی ہی ہیں۔“

جب میں اسٹاڈ سے ملاقات کے لیے پٹنہ پہنچا تو برادر م سید وسیم اللہ صاحب کے یہاں قیام کیا تھا، جوان دنوں سیکرٹیریٹ میں ملازم تھے اور کسی اونچے منصب پر فائز تھے۔ جماعت اسلامی سے ان کا تعلق ہمدردی کا تھا لیکن اس تعلق کی بنا پر ان کے خلاف کارروائی چل رہی تھی۔ اسٹاد محترم سے پہلے جو گورنر صاحب تھے، انھوں نے کوئی آرڈیننس جاری کیا تھا کہ جو سرکاری ملازم کسی سیاسی سرگرمیوں میں ملوث پایا جائے گا، اس کا compulsory retirement [جبری سبک دوشی] ہو سکتی ہے۔ اسی آرڈی ننس کے تحت وسیم اللہ صاحب کے خلاف کارروائی ہو رہی تھی۔ حالانکہ اس آرڈی ننس کی مدت ختم ہو چکی تھی اور گورنر صاحب بھی تشریف لے جا چکے تھے۔ میں نے وسیم اللہ صاحب سے اس آرڈی ننس کا نام اور نمبر وغیرہ لے کر اسے اسٹاڈ کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے چشمہ بدل کر بغور اس کو پڑھا اور پوچھا کہ ”اس طرح کے کتنے آدمیوں کے خلاف کارروائی ہوئی ہے؟“ میں نے عرض کیا: ”بہار میں تقریباً ۱۲۰ اشخاص کو جو جماعت اسلامی کے رکن تھے اور سرکاری ملازم بھی تھے، پرائمری سکول کے ٹیچر سے لے کر گزٹیڈ آفیسر تک کو جماعت اسلامی کی رکنیت کے جرم میں برطرف کیا جا چکا ہے۔ ان لوگوں نے ملازمت سے برطرفی کو گوارا کیا اور جماعت سے تعلق کو برقرار رکھا۔ لیکن وسیم اللہ صاحب جماعت کے رکن نہیں ہیں۔ ان پر جماعت کی رکنیت کا غلط الزام لگا کر ان کو پریشان کیا جا رہا ہے۔“ اسٹاڈ نے اس پر زے کو رکھ لیا۔

ہماری یہ ملاقات بہت زیادہ طویل ہو گئی تھی اور ان کے پاس یاد دہانی کی گھنٹی بار بار بجتی

رہی۔ جب ہماری گفتگو ختم ہوئی تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ مقررہ وقت سے زیادہ ہی وقت صرف ہو چکا ہے اور لوگ انتظار میں بیٹھے ہوں گے۔ باقی ان شاء اللہ آئندہ۔ اس طرح ان سے مصافحہ کر کے رخصت ہوا اور وہ دروازے تک پہنچا گئے۔

کچھ دنوں کے بعد جب وسیم اللہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ ان کے خلاف کارروائی ختم ہو چکی ہے اور ان کی ترقی کے ساتھ ان کی تنخواہ میں بھی اضافہ کیا گیا ہے اور میرے ساتھ جوسی آئی ڈی کی نگرانی تھی، وہ بھی ختم ہو گئی۔ درہنگا میں سی آئی ڈی کے ایک افسر نے آکر اطلاع دی کہ ہمارے پاس آرڈر آ گیا ہے کہ اب آپ کی نگرانی نہ کی جائے۔

● تیسری اور آخری ملاقات: جماعت اسلامی ہند نے مجھ کو ۱۹۶۲ء میں جماعت کی دعوت کے تعارف کے سلسلے میں آسام کا امیر حلقہ بنا کر گواہٹی بھیجا۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۰ء تک میں گواہٹی آسام میں رہا۔ ابتدا میں ۱۹۶۷ء میں جماعت اسلامی ہند کے اجتماع میں شرکت کے لیے مجھ کو دلی جانا تھا۔ میں نے استاد محترم کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا کہ میں دلی حاضر ہو رہا ہوں اور ان تاریخوں میں مرکز جماعت اسلامی میں مقیم رہوں گا۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں، اگر موقع ہو تو وقت مقرر فرما کر مرکز جماعت اسلامی کے پتے پر مجھے مطلع فرمائیں۔ اس کے جواب میں استاد کا جلد ہی ایک گرامی نامہ ملا جس میں درج تھا کہ ”جن تاریخوں میں آپ دلی رہیں گے، ان تاریخوں میں افسوس ہے کہ میں دلی میں نہ رہ سکوں گا۔ پہلے سے جنوب کا پروگرام بن چکا ہے۔ ان شاء اللہ جلد ملاقات ہوگی۔

اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد گواہٹی میں استاد کے پرائیویٹ سیکرٹری اور ملٹری سیکرٹری کے خطوط ملے۔ جس میں درج تھا کہ استاد ۲۵ اپریل کو گواہٹی پہنچ رہے ہیں۔ اس شام کو ساڑھے پانچ بجے سرکٹ ہاؤس میں مجھ سے مل کر وہ خوش ہوں گے۔ اس کے بعد دوسرے دن سی آئی ڈی کے ایک افسر میرے پاس آئے اور بتایا کہ پریسیڈنٹ ۲۵ اپریل کو گواہٹی پہنچ رہے ہیں۔ ان کے پروگرام میں آپ سے ملاقات بھی شامل ہے۔ مہربانی کر کے سی آئی ڈی آفس آئیے، آپ کو ایک پاس دیا جائے گا۔ اس کو لے کر ہی آپ ان سے مل سکتے ہیں۔ چنانچہ میں سی آئی ڈی دفتر پہنچ گیا۔ سی آئی ڈی افسر نے مجھ سے پوچھا کہ صدر جمہوریہ ہند کس سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتے ہیں اور ان کا آپ سے

کیا تعلق ہے؟ میں نے ان کو بتایا کہ وہ میرے استاد رہ چکے ہیں۔ میں نے جامعہ ملیہ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۰ء تک میں وہاں رہا۔ وہ ہمارے استاد بھی رہے اور وائس چانسلر بھی رہے۔ اسی تعلق سے اُن سے ملنا ہے۔ چنانچہ مجھ کو ایک پاس دیا گیا، اس کو لے کر میں ان سے ملا۔ میری ملاقات سے پہلے گواہی کے ایک بڑے میدان میں ان کی تقریر تھی۔ پہلے میں جلسے میں شریک ہوا اور ان کی تقریر سنی۔ اس کے بعد مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے سرکٹ ہاؤس پہنچ گیا۔

مجھے ویننگ روم میں بٹھایا گیا۔ ان کے ملٹری سیکرٹری میرے پاس آئے اور بتایا کہ سب سے پہلے آپ کی ملاقات ہے اور آپ کی ملاقات کے لیے ۵ منٹ کا وقت دیا گیا ہے۔ جب آپ کی طلبی ہوگی تو میں آپ کو کمرہ ملاقات میں پہنچا دوں گا اور کمرہ بند ہو جائے گا۔ جب آپ کا وقت ختم ہو جائے تو میں دروازہ کھول کر کھڑا ہو جاؤں گا تو مہربانی کر کے آپ اٹھ جائیے گا، ورنہ جب تک آپ بیٹھے رہیں گے، وہ بھی آپ سے باتیں کرتے رہیں گے اور آپ کے بعد آنے والوں کو موقع نہیں مل سکے گا۔ اس لیے کہ اس کے بعد نماز کا وقت ہو جائے گا اور وہ نماز پڑھیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ ٹھیک ہے، مجھے کوئی عرضداشت نہیں پیش کرنی ہے اور نہ کوئی لمبی چوڑی گفتگو ہی کرنی ہے۔ ہم ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کریں گے اور وقت ختم ہونے پر اُٹھ آئیں گے۔ ہماری یہ گفتگو ملٹری سیکرٹری سے ہو رہی تھی کہ اسٹاڈنٹ کے نہرو کے ساتھ، جو اس وقت آسام کے گورنر تھے، سامنے آئے اور اُن سے جدا ہو کر ملاقات کے کمرے میں گئے اور گھنٹی بجائی۔ مقررہ وقت سے پہلے ہی مجھے طلب کر لیا۔ میں اندر داخل ہوا اور سلام عرض کیا۔ وہ اٹھے، بڑھ کر گلے لگایا۔ خیریت دریافت کی اور پوچھا کہ ”آپ آسام کیسے آ گئے؟“ میں نے عرض کیا کہ ”آپ تو جانتے ہیں کہ ہم لوگوں نے جماعت اسلامی ہند بنائی ہے اور کچھ لوگوں نے اپنی زندگیاں جماعتی سرگرمیوں کے لیے وقف کر دی ہیں۔ میں بھی اُن میں سے ایک ہوں۔ ۲۲ سالوں تک بہار، اڑیسہ، بنگال میں جماعت اسلامی ہند کی دعوت پیش کرتا رہا۔ اللہ کے فضل و کرم سے وہاں کچھ کارکن تیار ہو گئے تو اب جماعت نے مجھ کو آسام بھیجا ہے تاکہ یہاں بھی جماعت اسلامی کی دعوت پیش کروں۔ ساتھ ہی ساتھ آسامی زبان میں اسلامی لٹریچر تیار کرانے کا کام میرے سپرد ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ آسامی زبان میں اسلامی لٹریچر کی بڑی کمی ہے۔“

انھوں نے فرمایا کہ ”آپ نے بڑے استقلال سے کام کیا۔“ میں نے عرض کیا کہ محض اللہ کی توفیق اور آپ لوگوں کی تعلیم و تربیت ہے کہ اس کام کی سعادت حاصل ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ ”آسامی زبان میں اسلامی لٹریچر کے تیار کرنے کے کرانے کا کام بھی بہت اہم ہے۔“ انھوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک سو روپے کا نوٹ نکال کر آسامی زبان میں اسلامی لٹریچر کے لیے دیا۔ میں نے قبول کرنے میں تامل کیا کہ آپ سفر کی حالت میں ہیں، فوری طور پر دینا کیا ضروری ہے۔ انھوں نے میری جیب میں نوٹ ڈال دیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ: ”بچھلے دنوں آپ نے محسن انسانیت بھیجی تھی، سیرت پر یہ کتاب مجھ کو بہت پسند آئی۔ سیرت پر میں نے بہت ساری کتابیں پڑھی ہیں، حتیٰ کہ مولانا شبلی کی سیرت النبیؐ بھی دیکھی ہے مگر محسن انسانیت مجھ کو بہت پسند آئی۔“

اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ اس مختصر ملاقات میں زیادہ ترغبی کے ارشادات سنوں گا اور اپنی طرف سے کوئی بات نہیں پوچھوں گا لیکن وہ خاموش ہو گئے تو میں نے عرض کی کہ آج جمعہ کا دن ہے، اگر گوبائی کی کسی مسجد میں جمعہ کی نماز بھی آپ کے پروگرام میں شامل ہوتی تو اچھا ہوتا۔ یہاں کے مسلمانوں کو توقع تھی کہ مسلمان صدر جمہوریہ ہند یہاں کی کسی مسجد میں نماز ادا کریں گے تو قریب سے انھیں دیکھنے کا موقع ملے گا۔ اس سلسلے میں گوبائی کے مسلمانوں کو مایوسی ہوگی۔ انھوں نے فرمایا کہ ”میرے دونوں گھنٹوں میں تکلیف رہتی ہے اور فرش پر نماز ادا کرنے میں تکلیف زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ میں چوکی پر بیٹھ کر پاؤں لٹکا کے نماز پڑھتا ہوں۔ کبھی کبھی عید، بقرعید کے موقع پر دہلی کی عید گاہ میں چلا جاتا ہوں تو بڑی تکلیف کے ساتھ نماز ادا کر پاتا ہوں۔“ میں نے عرض کیا: یہ عذر معقول ہے لیکن لوگوں کو اس کی خبر نہ ہوگی۔

اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ ”آپ کے جو بھی ہوم فیسر ہوتے ہیں، جماعت اسلامی کے خلاف غلط الزامات لگایا کرتے ہیں اور ہم لوگ ان کی صفائی میں جو کچھ کہتے ہیں، ان کا وہ کوئی نوٹس نہیں لیتے۔ ایک طرح کے الزامات بار بار دہراتے رہتے ہیں۔“

انھوں نے فرمایا کہ ”وہ اپنا کام کرتے ہیں۔ آپ اپنا کام کیجیے۔ بات دراصل یہ ہے کہ آج کل سب لوگوں کو اور سب جماعتوں کو خوش رکھنے کے لیے اور توازن برقرار رکھنے کے لیے

سیاسی لوگ ایسی بات کہتے ہیں اور ایسی حرکتیں کرتے ہیں جو حقیقت اور صداقت کے خلاف ہوتی ہیں۔ پتا نہیں کہ خود چوہان جی کی (جو اس وقت ہوم منسٹر تھے) جماعت کے بارے میں اپنی رائے کیا ہے۔ لیکن عام طور سے ایسا ہوتا ہے کہ الیکشن میں کامیابی کی خاطر لوگ ایسا کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے الیکشن کا موجودہ طریقہ غلط ہے۔“

اس موقع پر میں نے عرض کیا کہ ”تب تو الیکشن میں جماعت اسلامی کا حصہ نہ لینا حق بجانب ہے۔“ اس کا انھوں نے خاموش مسکراہٹ سے جواب دیا۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ بھارت میں فسادات کا سلسلہ آخر کب ختم ہوگا؟ میرے اس سوال پر وہ افسردہ ہو گئے اور کچھ دیر سکوت کے بعد فرمایا: ”ہم لوگ مسلمان ہیں اور فسادات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں، لہذا فسادات کو زیادہ محسوس کرتے ہیں، ورنہ حکومت کی کون سی کل سیدھی ہے؟ دیکھیے تلنگانہ میں کیا ہو رہا ہے؟ (اس وقت آندھرا پردیش میں تلنگانہ کی پُر تشدد تحریک زوروں پر تھی)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری لیڈر شپ بہت کمزور ہے۔“

یہ سن کر میں حیرت میں مبتلا ہو گیا کہ اپنی ہی حکومت کے سلسلے میں صدر جمہوریہ کیا فرما رہے ہیں۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ صدر کے ملٹری سیکرٹری دروازہ کھول کر نمودار ہوئے اور میں ان کی ہدایت کے مطابق اُٹھ کھڑا ہوا۔ استاد محترم بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں الوداعی سلام کر کے ہاتھ ملا کر دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ بھی میرے کاندھوں پر شفقت سے ہاتھ رکھے ہوئے دروازے تک یہ کہتے ہوئے آئے: ”اللہ آپ لوگوں کو کامیاب کرے، آپ لوگوں کی میرے دل میں بڑی قدر ہے۔“ اس آخری ملاقات کے بعد جب میں باہر نکلا تو میں بہت خوش اور مسرور تھا کہ انھوں نے میری سرگرمیوں کی تائید فرمائی اور دعا دی۔ ان کی حوصلہ افزائی اور دعائیں میرے کانوں میں گونجتی رہیں اور اب تک گونج رہی ہیں، مگر افسوس کہ میری خوشی اور مسرت کے لحاظ بہت عارضی ثابت ہوئے۔

ایک ہفتہ بعد ۳ مئی ۱۹۶۹ء کو میرے ایک دوست نے آ کر خبر دی کہ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین انتقال کر گئے ہیں، **إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا إِلَیْہِ رَاجِعُونَ**۔ یہ خبر سن کر میں اس درجہ متاثر ہوا کہ بستر پر جا کر لیٹ گیا اور دیر تک روتا رہا۔ جب کچھ سکون ملا تو وہاں سے اپنے ایک عزیز کے

یہاں چلا گیا جن کے پاس ریڈیو سیٹ تھا۔ بستر پر لیٹے لیٹے، اس وقت تک ریڈیو سننا راجب تک ان کی تجہیز و تکفین نہ ہو گئی۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی زندگی ان دوحرفوں کی تفسیر تھی: ”بادوستاں ملطف، بادشمنان مدار“، یا اقبالؒ کے اس مصرع کے مصداق تھے: ”مروت حسن عالم گیر ہے مردانِ غازی کا“۔

یا اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق تھے: ”تم میں سے اچھا انسان وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو۔ اور اللہ نے مجھ کو اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث فرمایا۔“

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاهُ ط (الحجرات ۴۹: ۱۳) ”تم میں سب سے محترم و مکرم بندہ وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈر کر زندگی گزارنے والا پرہیزگار ہو۔“

نوٹ: ڈاکٹر ذاکر حسین بر عظیم کی سیاست، دانش وری اور تعلیم کے شعبوں میں ایک بڑا نام ہے۔ صدر جمہوریہ ہند کے منصب پر فائز ہو کر وہ ترقی اور عروج کی انتہا کو پہنچ گئے۔ بر عظیم میں کوئی شخص، خصوصاً ایک بھارتی مسلمان، اس سے بڑے عہدے کا تصور نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا سیاسی گراف تو بہت اونچا چلا گیا مگر تعلیم (جو ان کا اصل میدان تھا) یا دانش وری کے بارے میں ان کی آدرشیں کیا ہوئیں؟

ان کے قریبی رفیق اور دانش ور پروفیسر محمد مجیب نے ان کی سوانح عمری میں ان کی شخصی خوبیوں کے ساتھ ان کی مصلحت اندیشی کا ذکر بھی کیا ہے۔ علی گڑھ کے پروفیسر اور نامور ادبی شخصیت اسلوب احمد انصاری نے ڈاکٹر صاحب کی وائس چانسلری کے زمانے میں انھیں قریب سے دیکھا۔ وہ لکھتے ہیں: ”حکمت عملی اور مصلحت اندیشی ان کی زندگی کے دو بنیادی تشکیلی اصول تھے۔ اس کا نتیجہ ہمیشہ مفاہمت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور کسی طرح کے تہمت (commitment) کی نفی کرتا ہے۔ مصلحت اندیشی، حق شناسی اور حق گوئی کے راستے میں، ان کے لیے عمر بھر زنجیر پائی رہی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے انھوں نے بڑے قابلِ قدر کام کیے [مگر] بعض اوقات صاحبانِ جاہ و منصب کے زیر اثر اور ان کے دباؤ میں آ کر نامنصفانہ طور پر اور جانب داری کے ساتھ ایسے لوگوں کو آگے بڑھایا جو اس اعزاز اور ترقی کے کسی طرح مستحق نہیں تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے ذہین اور فطین اور اعلیٰ فن کار ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں لیکن ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔“

ڈاکٹر صاحب کی اس مثال سے یہ واضح ہے کہ انسان کی ذہانت و فطانت، اگر مصلحت کو شی کو راہ نما

بنالے تو حاصلِ حیات کیا ہوتا ہے۔ (مرتب)